...وں میں لگا دیا ہے اور یا انسان عقل و فکر جو ان سے بالاتر ہے؟ ان دونوں کا انکار ہونا ممکن ...یں ہے یا چونکہ ان مخصوص قوانین کا وجود ناقابل انکار ہے جن کی مشینوں کے تمام پرزوں ...پر حکومت ہے لہٰذا وہ طاقت جو ان قوانین سے بالاتر ہو موجود نہیں ہے! ہمیں کہنا چاہیئے ...کہ ان مشینوں کا کوئی موجد اور ان کا چلانے والا کوئی انجینیر نہیں ہے!!

ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اس بات کو ماننے کے لیئے تیار نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسے ان دونوں چیزوں کے درمیان کوئی تضاد اور ٹکراؤ نظر نہیں آتا کہ علمی قوانین اور ان مشینوں کے لیئے موجد اور انجینیر دونوں ہوں، وہ ان قوانین کو انسانی دماغ کی پیداوار سمجھتا ہے۔

پھر بعینہ یہی فیصلہ اس نظام کائنات اور مادی قوانین کی بابت کیوں نہ کیا جائے؟

نیچر خدا کا فعل ہے

وہ چیز کہ جس کا نام ہم نے "نیچر" رکھا ہے، وہ راز کہ جن کا سائنسدانوں نے جدید علوم کی مدد سے انکشاف کیا ہے اور جن پر فخر کر رہے ہیں، وہ تمام گتھیاں جو سائنس کی طاقتور انگلیوں نے کھول دیں، وہ رموز کائنات جنھوں نے اپنے شاندار، خوبصورت چہرے کو نیچر کے اس گدے اور دبیز پردے کے پیچھے چھپا رکھا ہے جو اپنے بیقرار عاشق سائنسدانوں کو طویل انتظار میں مبتلا بنائے ہوئے ہیں جن کی تعداد ان رموز و اسرار سے بہت زیادہ ہے جن کا انکشاف ہو چکا ہے، یقیناً یہ سب چیزیں خدا کا فعل، خدا کی مشیت اور اس کے طاقتور ارادے کی جلوہ گاہ ہیں، ان میں سے کوئی مستقل اور صاحب اختیار نہیں ہے۔

اگر ستاروں کو اپنی اپنی گردش گاہوں میں اصول جذب و کشش اور اپنے مرکز سے فرار کی ہمہ گیر طاقت نے محدود بنا کر منظم، مرتب، دائمی گردش پر مجبور کر رکھا ہے تو ہرگز یہ دونوں طاقتیں ارادہ اور اختیار نہیں رکھتی ہیں۔ وہ اپنے نتائج اور اثرات تک سے بے خبر ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ پورا بے جان نیچر ایک کمسن بچہ کے برابر بھی عقل و شعور، ارادہ و اختیار نہیں رکھتا ہے۔ اس کے باوجود یہ عمومی اصول و قوانین ایک

حیرت انگیز نظام کے ساتھ، غیر معمولی پابندی کے ساتھ، ایک انتہائی منظم پروگرام کے مطابق ایک معین مقصد کے ماتحت برابر اپنے انتہائی اہم فرائض کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

حضور والا! یہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس علم و قدرت کے مرکز اعلیٰ کو موجود ماننے پر ہمیں مجبور کیا ہے۔ یہ سب کے سب اس مبدأ اعظم کے وجود کے گواہ ہیں۔ یہ خاموش ہونے کے باوجود ہزارہا زبانوں کے مالک ہیں، یہ زبانیں اپنے پیدا کرنے والے کے علم و حکمت کی تشریح کر رہی ہیں۔ یہ سب اس کے فرمان بردار، اس کے احکام کے تابعدار ہیں۔

گونگا، بہرا، بے ارادہ، بے شعور نیچر ایک مرتب، منظم، بامقصد مٹی کا ایک معمولی سا گھروندا نہیں بنا سکتا۔ پھر اس میں یہ قدرت اور طاقت کہاں سے آئی کہ وہ بے قیمت، پست، ناقابل مشاہدہ موجود یعنی نطفہ کو اتنی عظمت عطا کرے، اس طرح اسے پروان چڑھائے کہ رفتہ رفتہ وہ ایک سوچنے، غور کرتے، بولتے ہوئے انسان کی صورت اختیار کرلے۔ ایسا انسان جس نے دنیا کی تمام فضاؤں کو اپنی عقلی کارگزاریوں کی جولانگاہ بنا رکھا ہے۔

وہ عالم جس کے اسرار و رموز کے مقابل تمام سائنسداں سرنگوں ہیں، جس کے کسی ایک راز کا انکشاف اگر کوئی سائنسداں کرلے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے سربلند بنا کر اس کا نام تاریخ بشریت میں ایک بڑے موجد اور محقق کی حیثیت سے ثبت ہو جاتا ہے، ایسا عظیم الشان عالم ہرگز بے روح مادے اور بے شعور نیچر کی کارگزاری نہیں ہے۔ یہ نیچر خدا سے بیگانہ نہیں بلکہ اسی کا ایک فعل ہے

عالمِ اسلام میں سائنس کے زوال کے اسباب اور اس کے احیاء کے شرائط

(۲)

جناب ڈاکٹر عرفان احمد لکچرر شعبۂ طبعیات، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج۔ اعظم گڑھ

عرصۂ دراز کی بے عملی کا علاج

سائنس کی حریت کا ایک اہم پہلو وہ سرپرستی تھی جو اسے عرب و اسلامی ممالک کی دولت مشترکہ میں حاصل تھی۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب نے ایک جگہ عربی ادب کے بارے میں جو لکھا ہے اگر تھوڑے سے رد بدل کے ساتھ وہی بات اس زمانہ کی سائنس کے متعلق کہی جائے تو یوں کہی جائے گی "دوسری جگہوں کے مقابلہ میں عالم اسلام میں سائنس کے پھولنے پھلنے کا انحصار زیادہ تر اس سرپرستی پر تھا جو اسے ارباب حل وعقد سے حاصل ہوتی تھی۔ جہاں جہاں مسلمانوں کی معیشت زوال پذیر تھی وہاں سائنس کی حالت بھی ابتر تھی۔ لیکن جہاں کہیں بھی شہزادوں اور وزیروں کو سائنس سے دلچسپی رہی یا جہاں بھی سائنس سے ان کے عیش وعشرت میں اضافہ کا امکان تھا وہاں یہ شمع جلتی رہی۔" اس بات کی مزید وضاحت کے لیے صرف ایک مثال دینی کافی ہوگی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ اس زمانہ میں سائنسداں کس شان سے رہتے تھے اور خلفاء ان کی کتنی قدر کرتے تھے۔ دربار بغداد کے مشہور نصرانی حکیم جبرائیل بن بختیشوع کو ہارون رشید کے سالے عیسیٰ بن جعفر سے ۵۰ ہزار درہم،

فاطمہ (جعفر برمکی کی والدہ) سے ۷۰ ہزار درہم، ابراہیم بن عثمان سے ۳۰ ہزار درہم، فضل بن یحییٰ سے ۵۰ ہزار درہم، شاہی تحفوں کی صورت میں ۱ لاکھ درہم، زرعی جائداد سے ۸ لاکھ درہم، یحییٰ بن خالد برمکی (وزیر ہارون رشید) سے ۷ لاکھ درہم، جعفر بن یحییٰ برمکی ۱۲ لاکھ درہم اور فضل بن یحییٰ برمکی سے ۶ لاکھ درہم سالانہ ملتے تھے یعنی اس کی سالانہ آمدنی تقریباً ۳۶ لاکھ درہم تھی۔

یہ صورت حال کم وبیش چودھویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ سرپرستی ختم ہو گئی۔ صورت حال کی اس تبدیلی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مراد سوئم کے حکم سے قسطنطنیہ کی مشہور رصدگاہ توپوں سے اڑا دی گئی اور اس اندوہناک واقعہ کا ذکر دربار کے شاعر علاء الدین منصور نے ایک نظم میں اس انداز سے کیا گویا یہ بہت خوشی کی بات تھی۔ رصدگاہ کو تباہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ رابغ بیگ کے علم الہیت کے جدولوں کی صحت کا کام مکمل ہو گیا جو اس رصدگاہ کے قائم کرنے کا مقصد تھا اس لیے اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور اس کے بعد تو زوال کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہی ہونے کو نہ آیا۔ ۱۸۰۰ء میں دولت عثمانیہ میں برطانوی قونصل ولیم ایٹون (William Eton) لکھتا ہے: "کسی کو بھی جہاز رانی کا کوئی علم نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی کو مقناطیس کا استعمال آتا ہے۔ سفر جو ذہنی نشوونما کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کا دروازہ ان لوگوں کے مذہبی تعصب نے ان پر بند کر دیا ہے اور ...... اس میں اس حسد کا بھی دخل ہے جو ان لوگوں سے ہو جاتا ہے جو بغیر کسی سرکاری کام کے غیر ملکیوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی شخص نہیں ملتا جس کو عام سائنس کی واقفیت ہو۔ خصوصاً اسلحہ سازی اور جہاز سازی سے متعلق لوگوں کو علاوہ سائنس سے رغبت رکھنے والوں کو لوگ تقریباً خبطی سمجھتے ہیں۔ یہ صرف انھیں لوگوں سے تجارت کرتے ہیں جو مفید اور بیش قیمت چیزیں لائیں تاکہ خود انھیں ان چیزوں کے بنانے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑے۔"

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تاریخ کے صفحات پلٹ دیں اور پھر اسی قابل ہو جائیں کہ سائنس کے میدان میں دنیا کی رہبری کر سکیں۔ ہم یقیناً ایسا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارا معاشرہ خصوصاً ہمارے

میدان میں کا بیڑا اٹھائیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہمیں نصف سے بھی زیادہ آبادی کو سخت سائنسی تربیت دینی پڑے گی اور پوری قومی پیداوار کا ایک یا دو فی صد حصہ بنیادی اور عملی سائنسی تحقیقات اور اس کے فروغ پر خرچ کرنا پڑے گا۔ یہ سب جاپان میں میجی (Meiji) انقلاب کے وقت ہو چکا ہے جب شہنشاہ نے قسم کھائی تھی کہ علم کو ہر قیمت پر ہر جگہ سے حاصل کیا جائے گا چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہو۔ یہی سوویت یونین میں ہوا جب پیر اعظم کی قائم کردہ سوویت اکیڈمی آف سائنس سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے ممبروں کی تعداد بڑھائیں اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کریں کہ ہر سائنسی میدان میں دوسروں پر سبقت لے جانا ہے۔ یہ اکیڈمی آج دس لاکھ ممبروں سے بھی زیادہ کی ایک خود مختار جماعت ہے جس کے اراکین اس سے منسلک مختلف اداروں میں کام کرتے ہیں اور انھیں وہ مراعات حاصل ہیں جس پر دوسرے رشک کرتے ہیں۔ اور یہی دعویٰ جمہوریہ چین میں طے ہوا ہے کہ اس برق رفتاری سے ترقی کی جائے کہ دولت برطانیہ کو ہائی انرجی فزکس، خلائی سائنس، جینٹکس (Gemetics)، مائیکرو الیکٹرانکس (Micro Eletranics) اور تھرمونیوکلیر انرجی (thermo no nuclear — Energy) کے میدانوں میں پیچھے چھوڑ دیں۔ اہل چین نے اس حقیقت کو بھی باور کرلیا ہے کہ ترقی کے لیے ہر قسم کی بنیادی بنیادی سائنس ضروری ہے اور یہ کہ آج کی بنیادی سائنس کی سرحد کل کی عملی سائنس کا حصہ ہوگی۔ انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ انھیں ہمیشہ بنیادی سائنس کی اگلی سرحدوں پر رہنا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اسلامی اور عرب قوموں کے مادی وسائل چینیوں سے کہیں زیادہ ہے اور انسانی وسائل بھی ان سے بہت کم نہیں ہیں۔ مزید چینی ہم سے سائنس کے میدان میں صرف چند دہائیاں ہی آگے ہیں۔ کیا ہم لوگ چین کے برابر بھی پہنچنے کا منصوبہ نہیں بنا سکتے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو زرعی وسائل سے لے کر خام تیل اور ہر قسم کی معدنیات تک کی دولت سے دوسری اقوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ نوازا ہے۔ افرادی قوت کی بھی حیثیت بھی کوئی کم نہیں ہے۔ پھر چاہے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم ...

بھی اغیار کے محتاج رہیں۔ اور تمدنی سہولتوں کا کیا ذکر اپنی ضروریات زندگی اور خاص طور کے لیے بھی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوں۔ اگر ہم اپنی تاریخ سے سبق لیں اور یکسوئی کے ساتھ علم وفن کی تحصیل میں منہمک ہو جائیں اور اپنے وسائل کو استعمال میں لاکر اپنی ضروریات خود فراہم کرنے کی صلاحیت پیدا کرلیں تو ہم نہ صرف دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ندامت سے بچ کر اپنی عزت نفس کو محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ دنیا کی کوئی طاقت ہماری طرف نظر بد اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کرسکے گی۔ لیکن ملت اسلامیہ کی ہر مملکت میں یہ وسائل وعناصر یکجا نہیں اور تقریباً ہر ایک ملک میں ایک یا دوسرے عنصر کی کمی ہے۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت یہ نظر آتی ہے کہ اسلامی ممالک باہمی اتحاد کی بنا پر ایک مربوط لائحہ عمل کے تحت ان وسائل کو مکمل طور پر بروئے کار لانے کے لیے اس طرح یکجا کرنے کی کوشش کریں کہ جہاں جو کمی ہے وہ دوسرے ممالک کے تعاون سے حتی المقدور پوری کی جائے۔ لیکن چونکہ ان وسائل سے کماحقہ استفادہ کے لیے سائنسی تعلیم وتربیت اور تحقیق کے فروغ کی بھی اشد ضرورت ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اسلامی دنیا مشترکہ طور پر ایسے اداروں (Laboratories) و تحقیقی مراکز کے قیام کا انتظام کرے جو افرادی قوت یا مالی وسائل کی کمی کے باعث اکثر مسلمان ممالک فرداً فرداً قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسے ادارے نہ صرف اسلامی اتحاد کا بلکہ باقی دنیا کے لیے عملی نمونہ پیش کریں گے بلکہ ان کے قیام سے پوری اسلامی دنیا مستفید ہو سکے گی اور دوسروں کے دست نگر نہیں رہے گی۔

اس طرح خود کفیل ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ امت مسلمہ اپنے قابل اور ہونہار افراد کو سائنس میں اعلیٰ ترین مدارج تک تعلیم وتربیت حاصل کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ امت مسلمہ کے عمائدین کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ اس کرۂ ارض کے وسائل پہلے ہی محدود ہیں اور اقوام عالم کی تعداد میں مسلسل اضافہ کے باعث ان وسائل کا ذخیرہ دن بدن کم ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ان کے استعمال اور استعمال پر قدرت حاصل کرنے کے لیے مستقبل قریب میں بین الاقوامی مسابقت کا

شدید ضرورت جانا ناگزیر ہے۔ ان حالات میں قدرتی وسائل کا پتہ چلانے، ان کو نکالنے کے استعمال کے لیے موزوں بنانے، اور ان سے مختلف آلات اور مشینیں سازوسامان اور ضرورت کی اشیاء کے لیے ہم دوسروں پر انحصار نہیں کر سکتے۔ یہ کام خود اپنے افراد ملت جس خلوص، لگن اور درد کے ساتھ کر سکتے ہیں اس کی توقع دوسروں سے رکھنا تضیع اوقات ہی ثابت ہوگا۔ اس لیے ہمیں سب سے اوّل تو معاشرہ میں اس امر کا احساس پیدا کرنا چاہئے کہ ملت اسلامیہ کی بقا، ترقی اور فلاح وبہبود کے لیے ہنرمند افراد اور ماہرین جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی ممالک میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی اسلامی دنیا اس قابل نہیں کہ اپنے بہت سے مایہ ناز سائنسدانوں اور ماہرین جو غیر اسلامی ممالک میں برسر روزگار ہیں کی خدمات سے استفادہ کر سکے۔ اس ضمن میں یہ ستم ظریفی بھی نظر آتی ہے کہ بعض ہنرمند اور قابل افراد اس وجہ سے ملک چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ انھیں اپنے معاشرہ میں موزوں ملازمتیں، کام کرنے کی سہولتیں اور مواقع نہیں ملتے۔ اور دوسری طرف ان ہی ممالک کے لیے بے شمار وسائل ایسے ہیں جو نامعلوم ہیں۔ جن کو نکالنے اور قابل استعمال بنانے کا خطیر کام انجام دینے کے لیے مناسب تعلیم وتربیت افراد ملک کے اندر دستیاب نہیں ہوتے اور باہر سے درآمد کرنے پڑتے ہیں۔ اس معمہ کی بنیادی وجہ متعلقہ افراد کی غلط قیاسی، ملک وملت سے وفاداری اور وابستگی پر ذاتی مفادات کو ترجیح اور ساتھ ہی ارباب اقتدار کی بے توجہی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ امت مسلمہ کے حالات اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتے جب تک اس میں علم وہنر اور تعلیم وتربیت کی انتہائی اہمیت وشعور کا وہ ذہنی احساس بیدار نہ ہو جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا امتیازی خاصہ تھا اور جس کی بدولت علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا تھا۔

اور آخر میں عالمی سطح پر سائنس کے میدان میں ہمارا دوسروں سے تعلق کا سوال آتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سوائے مصر کے دنیائے اسلام اور سرزمین عرب کا کوئی دوسرا ملک پانچ سے زیادہ بین الاقوامی سائنس انجمنوں کا رکن نہیں ہے۔ مصر کا تعلق البتہ سولہ بین الاقوامی سائنس انجمن سے ہے۔ سائنسی تحقیقات کا کوئی بین الاقوامی ادارہ ہمارے ملک کے اندر موجود نہیں ہے۔ اسلامی